انٹرویو

قسط ۲

ضبط و ترتیب : سمیع الحق

علامہ قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

سے

ایک ملاقات

★

حضرت قاسم العلوم کی سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارہ میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارہ میں ارشاد فرمانے کی جرأت کی گئی۔

حضرت مسکرا کر فرمانے لگے : میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتویؒ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتویؒ کی نسل چلے تو دوسری شادی دیوبند میں کرائی، اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے، لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔ تو حضرت شیخ الہند کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو تو فتح پور ہسوہ میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارہ میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ تو حضرت مولانا عبد السمیع صاحب کو حضرت شیخ الہند نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ کہ مولانا حافظ احمد صاحب صاحبِ اولاد ہو وہ سفر کر کے گئے، جا کر عرض کیا کہ شیخ الہندؒ کا بھیجا ہوا ہوں، اور یہ درخواست ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا۔ مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے۔ صبح کو آئے اور خوش ہوئے۔ فرمایا

کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا، اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا، اور حاجی بھی ہوگا ——

—— مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔ اس ٹانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحب تھے اور میں تھا۔ مولاناؒ نے کہا کہ بھئی میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ جب تو حافظ قرآن ہوگیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہوگیا۔ پھر تو نے قرأت کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔ آج تو حج کو جا رہا ہے تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے۔

آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا —— میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کیلئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے۔ اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے۔ اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے کان میں اذان دی —— حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کے صاحبزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔ وہ دیوبند تشریف لائے۔ اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں نے بخش چکا ہوں، دعا کیا کروں۔؟ قبول کر چکا ہوں۔ اب اللہ جانے اس کا کیا مطلب تھا۔ ظاہری صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی عزیز میرے گھر میں آئی، ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی —— اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا، تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا، دور دور سے مہمان آئے تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے والد نے بسم اللہ کرائی، اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا، اور ایک مقطع۔ مطلع تو یہ تھا ؎

ہذا مکتب طیب کی مبارک تقریب کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے تھا ؎

رب یسر جو کہا اس نے تو بے روئے ابا فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ "تمم بالخیر"

تو بہر حال ان اکابر کے توجہات تھے، میں نے اپنی زندگی ایسی گذاری جیسے شہزادے گذارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتویؒ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اسطرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمان صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب" ایک ایسا موضوع جس پر بحث و فکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و محرکات پر بلا مبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی۔ منبر و محراب کو لیجئے یا میدان صحافت و انشاء وہ کونسا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کیلئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور اب جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے ــــ مگر ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔

ــــ یہی تصویر حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کے سامنے آچکی ہو گی کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا "مسلمانوں کے تنزل کے اسباب۔؟" اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملا نے کی رائے کیا معتبر ہو گی ــــ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا ہی حق سمجھتی ہے۔ حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا ــــ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کی بجائے اپنے معاشرہ کے چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا یہی کام ہے کہ علمی

اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینا چاہی، اور نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کر سکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے۔؟ افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہہ کر ان کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفۂ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ـــــ کہ ابھی دو تین برس کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے، سانوال دار العلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے، یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں، میں نے کہا جی ہاں اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا، میں نے کہا ہاں سبب ہے، کہا کیا سبب ہے؟ میں نے کہا بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور برسر اقتدار انسان آپ ہر چیز کو سیاسی نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں۔ تو میرا نقطۂ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا، اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا، اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں ـــــ تو میں نے کہا سنی لیجئے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے، اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے، دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں۔ تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اسکی مثال بھی ہے، میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت

باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیا کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی۔ اس وقت عورت نہ صرف یہ کہ گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کے کوکھ سے جو اولاد پیدا ہو، کیا اس میں کوئی حیا اور شرم و غیرت ہو گی، دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے۔ تو سکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہے یا جانور۔ اس قدر بیہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے ——

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں، سو پچاس مسافر اترے کسی نے سو گنے کسی نے دو سو گنے کسی نے پچاس کسی نے گٹھڑی باندھ لی اور قطعاً انہیں احساس نہیں کہ یہ چیز ہماری ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا بار ان کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ گھسوٹ کے یہ کیا کریں گے ——

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارو مدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ۔ تو جب تاجروں میں خیانت آجائے تو ملک کی برقراری کیسے ہو سکتی ہے ——

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقربا پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے، اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آجائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا۔ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن اسکی فکر کسی کو نہیں، کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں۔؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی، کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے، اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔ تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور

گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکالدیں، باقی یہ ہوگا نہیں۔ میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے، اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے ـــــ

راقم السطور نے کہا حضرت ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں، اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔ اب اس کے بعد اصلاح کے کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمد اللہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا، اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کرو اور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک اور قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے، سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کیطرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آ جائے حکومت، تو وہ بھی پھر چڑھ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کریگی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کیلئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈالی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام۔؟

"پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے۔ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے عرض کیا تھا کہ جو مفکر قسم کے چند علماء ہیں اور با اثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کردیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کے بقاء کی خاطر فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک و قوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اسی سے قائم ہے ـــــ اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے، بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں، پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دئے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے ـــــ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور باریابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا کہ مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں۔ اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے، اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو۔ ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اسکی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا۔ بلکہ وہ پہلے ڈھونڈھتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا۔؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے تو آپ انتخاب کریں۔ تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں ہے کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے۔

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کردیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت مؤخر ہے اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کردیں جو عقلی منکرات ہیں۔ اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے، اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں مگر کم از کم منکرات تو ختم کردیں اور یہ بھی

تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں، آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزو تمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں ـــــ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں ان کے علاوہ عامۃً وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے، لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا اسکی حکومت نہایت اعلیٰ گذری، حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا ـــــ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف لگے ہوئے تھے ـــــ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا ـــــ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارہ میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے، تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ، نہ وہ طلب کریں گے ـــــ"

حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے اور گھمنڈ پر غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقدار کی خاطر اس خلاء کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب مدظلہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے۔؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا: حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے۔؟

حضرت نے فرمایا: ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ موجودہ دور کی ترقیات میں اسلام حارج ہے۔

بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہیئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کارآمد ہو، اسلام اس کا مخالف نہیں۔ مگر وہ منکرات جو دنیا کی ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں، زناکاری، جوا، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جسکی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں، اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں، اسلام کبھی بھی اسکی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ تو سع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اسکی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کو جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو ـــــ پھر قاری صاحب نے فرمایا: مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں اخلاص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے ـــــ

ـــــ رات ڈھل رہی تھی، وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گذر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والے ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی ریکارڈنگ مشین ہے جو ایک ایسے نامۂ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے جسکی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آجائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا: مالھذا الکتٰب لا یغادر صغیرۃً ولا کبیرۃً الا احصاھا۔

ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گذر رہا تھا، مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آجائے۔ اور پوچھ بیٹھا کہ الحق کے لئے کونسا طریقۂ کار پسندیدہ ہے ـــ؟ فرمایا: وہی پالیسی جو میں نے عرض کر دی۔ توافق سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں، تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی ـــ"

حضرت! جب الحاد اور بے دینی بالکل غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت ـــ؟

برجستہ فرمایا: اسی کی اصلاح کیلئے تو توافق کی ضرورت ہے اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ اُن افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے ـــــ

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضاء چھاگئی ہے۔ اصلاح کے مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہے ــــ؟ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ نے فرمایا: کام کیلئے اوّلین شرط یہ ہے، کہ مایوس نہ ہو جائیے آپ تو ورثۂ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے، جب حضرت نوحؑ نے بددعا کی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ــــ ساڑھے نوسو برس تک نصیحت فرماتے رہے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ــــ

دیگر بلاد اسلامیہ تو دہریت مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آہی گئے اور مغلوب ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے ــــ؟ حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہیئے کہ آج بلاد اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیرباد کہہ دیا۔ وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے۔؟

حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو ارباب عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو ــــ فرمایا: حضورؐ نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا بعدی ابداً ان تمسکتم بھما۔

حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارہ میں کوئی نصیحت۔

فرمایا: آپ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد اللہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں، ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہو گی، خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو بحمد اللہ دین مجسّم ہیں۔

حضرت! مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتار ترقی کیا ہے۔ اور بجٹ۔؟

فرمایا: انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا، اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے۔ انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے۔ پہلے آٹھ شعبے تھے اب ۲۴ شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ ۳۸ تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔

آخری سوال تھا کہ حضرت نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات

ہیں ——؟ فرمایا: اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں —— دورانِ گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی سیاست اور دین میں بَیر ہے، اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے، اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہے دین کے —— جو چیزیں دین میں حرام ہیں اس کے ہاں واجب ہیں، جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ —— "مولوی صاحب آج کی سیاست اور دیانت میں بَیر ہے۔"

—— اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادلِ ناخواستہ اس پر لطف محفل کی لبساط لپیٹنی ہی پڑی ——

سے جمع خواطر میں چونکہ مدد مل جاتی ہے اس لئے مقصود میں کامیابی زیادہ ہوتی ہے۔

۷۔ ایک مجلس میں فرمایا: توبہ صرف ترک عصیان کا نام نہیں بلکہ ترک من خشیۃ اللہ کا نام توبہ ہے۔ (مثلاً ایک شخص شراب اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اس میں جسمانی ہلاکت ہے خشیۃ اللہ کو اس میں دخل نہ ہو تو نہ اس کو توبہ کہیں گے اور نہ توبہ کے اثرات اور برکات محو ذنب وغیرہ اس پر مرتب ہوں گے۔)

۸۔ ایک دفعہ فرمایا: واردات یعنی حالات وکیفیات حالت انبساط و مسرت میں محسوس ہوتے ہیں، حالت غم و پریشانی میں ان کا ورود نہیں ہوتا۔

۹۔ ایک دفعہ فرمایا: شغل اس وقت کرنا چاہئے کہ نہ بھوک ہو اور نہ زیادہ کھایا گیا ہو۔

۱۰۔ فرمایا: ایک دن حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کو بہت فرشتوں کا اترنا محسوس ہوا، پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسی دن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا، فرمایا اسی وجہ سے یہ فرشتے اترے تھے۔